(وعظ)

التعمیم لتعلیم القرآن الکریم

سلسلہ ۸

تعلیم القرآن

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ

عنوانات

○

مولانا مشرف علی تھانوی
مہتمم دارالعلوم الاسلامیہ لاہور

شعبہ نشر و اشاعت دارالعلوم الاسلامیہ کامران بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

فون نمبر [illegible] پرانی انارکلی

فون نمبر [illegible] کامران بلاک

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہ ورسولہ صلی اللہ علیہ وعلیٰ اٰلہ واصحابہ وبارک وسلّم اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۰ قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم خیرکم من تعلم القرآن وعلمہٗ

ہر چند کہ پہلے بیان کے متعلق عزم تو کیا معنی بلکہ عزمِ عدم تھا یعنی بیان کا تو کیا قصد ہوتا یہ بات طے ہو چکی تھی کہ بیان نہیں کرونگا کیونکہ اوّل تو سفر کا تعب[1] تھا دوسرے طبیعت میں بشاشت[2] بھی نہ تھی اگر طبیعت بشاش ہو تو تعب سفر مجھ کو بیان سے مانع نہیں ہوتا مگر یہاں پہونچکر کچھ طبیعت میں بشاشت وانبساط بھی نہ ہوا اس لیے یہ عزم کر لیا تھا کہ بیان نہ کروں گا۔ چنانچہ اس کی اطلاع بھی کر دی تھی لیکن جب اس جلسہ کی گفتگو ہوئی تو کچھ کچھ خیال پیدا ہو گیا تھا اور اس جلسہ کو دیکھ کر گو مجمع قلیل ہی ہے ارادہ ہو گیا کیونکہ مخلصین گو قلیل ہی ہوں وہ کثیر کے حکم میں ہیں چونکہ اس وقت مدرسہ کے طلبا کی دستاربندی کا جلسہ ہے اس لیے مناسب یہ ہے کہ تعلیم وتعلّم[3] قرآن کے متعلق کچھ بیان کیا جائے۔

تعلیم وتعلّم قرآن کی فضیلت

جو حدیث میں نے پڑھی ہے اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم وتعلّم قرآن کی ایک بڑی فضیلت بیان فرمائی ہے حضورؐ کا ارشاد ہے خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهٗ یعنی تم میں بہتر اور افضل وہ لوگ ہیں جو قرآن کو سیکھتے اور سکھاتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کی مشغولی بہت بڑی طاعت[4] ہے اور جو لوگ اس کی تعلیم وتعلّم میں مشغول ہیں وہ سب سے بہتر ہیں اب

---

[1]: تھکن [2]: تازگی [3]: قرآن سیکھنا اور سکھانا۔
[4]: نیکی

دیکھنا یہ ہے کہ ہم لوگ اس حدیث پر کہاں تک عمل کرتے ہیں آیا ہم کو قرآن کی تعلیم و تعلم پر ایسی ہی توجہ ہے جس کو یہ[1] حدیث مقتضی ہے یا ایسی توجہ نہیں ہے۔ مجھے افسوس کے ساتھ شکایت کرنا پڑتی ہے کہ ہم لوگوں کو قرآن کی طرف ایسی توجہ نہیں ہے یعنی ہمارا برتاؤ اہل قرآن کے ساتھ ویسا نہیں ہے جیسا اس حدیث کے بعد ہونا چاہیئے یہ اعتقاد تو مسلمانوں کا ضرور ہوگا کہ اہل قرآن سب سے افضل ہیں کیونکہ حدیث میں اُن کو افضل فرمایا گیا ہے اور اگر کسی کا یہ اعتقاد بھی نہ ہو تو اس کے دل میں اسلام ہی نہیں مگر عملاً ہم ان کو اپنے سے افضل تو کیا برابر بھی نہیں سمجھتے چنانچہ مشاہدہ ہے کہ قرآن پڑھنے پڑھانے والوں کی لوگ کچھ بھی عظمت نہیں کرتے لوگ ان کو اس لیے حقیر سمجھتے ہیں کہ وہ دنیا کے کسی کام کے نہیں رہتے حالانکہ یہی وجہ اُن کی فضیلت کو مقتضی ہے۔ بھلا اس سے زیادہ اور کیا فضیلت ہوگی کہ یہ لوگ محض خُدا کے کام میں لگے ہوئے ہیں اور دنیا جو خُدا کے نزدیک کچھ قدر کی چیز نہیں ہے یہ اُس کے کام کے نہیں تو جس بات کو تم سبب[2] تحقیر سمجھتے ہو وہی ان کی عزت کا سبب ہے مولانا فرماتے ہیں ؎

تا بدانی ہر کرا یزداں بخواند ۔۔۔ از ہمہ کار جہاں ۔ بیکار ماند

یعنی جس کو خُدا تعالےٰ اپنے کام میں لگا لیتے ہیں وہ دُوسرے کام کا نہیں رہا کرتا۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ قرآن پڑھنے پڑھانے والے دیوانے ہیں کہ سارے کام چھوڑ کر ہر وقت قرآن ہی کی تلاوت میں رہتے ہیں مگر ان کے واسطے یہی دیوانگی سبب فخر ہے۔ خیر بھی ہے یہ کس کے دیوانے ہیں؟ ؎

ما اگر قلاش و گر دیوانہ ایم ۔۔۔ مست آں ساقی و آں پیمانہ ایم

یہ خُدا کے دیوانے ہیں اور حقیقت میں یہی لوگ عاقل ہیں کہ آخرت کی ترقی میں مشغول ہیں اور جو لوگ ان کو پاگل کہتے ہیں حقیقت میں وہ خود پاگل ہیں کہ آخرت کی نعمتوں کو چھوڑ کر ہمہ تن دنیا پر متوجہ ہیں۔ ؎

---

[1] :۔ جو کہ اس حدیث کا تقاضہ ہے۔ [2] :۔ حقارت کی وجہ۔

؎ ہم اگر مفلس اور اگر دیوانہ ہیں ۔۔۔ تو اس ساقی اور اس پیمانہ سے مست ہیں

اودست ویرانہ کہ دیوانہ نہ شد — مرعس را دید درخانہ نہ بشد[1]

عارف شیرازی فرماتے ہیں کہ ؎

مبیں حقیر گدایان دلق راکیں قوم — شہانِ بے کمر و خسروانِ بے کلہ اند[2]

اہل قرآن کی تعظیم نہ کرنے کا راز اور اہل قرآن کی عظمت نہ کرنے کا راز یہ ہے کہ لوگ جن کو اہل اللہ سمجھتے ہیں اُن ہی کی قدر کرتے ہیں۔ چنانچہ درویشوں کی بہت قدر ہے۔ گو وہ لنگوٹہ ہی باندھے ہوئے ہوں کیونکہ ان کو اللہ والا سمجھا جاتا ہے۔ اور ان قرآن والوں کو اللہ والا ہی نہیں سمجھتے۔ اور یہ بہت بڑی غلطی ہے کیونکہ قرآن کا تعلق خدا تعالےٰ سے ایسا ہے کہ اتنا تعلق کسی چیز کو خدا تعالےٰ سے نہیں ہر چیز کا تعلق خدا سے بواسطہ ہے اور قرآن کا تعلق بلاواسطہ ہے۔ کیونکہ قرآن کلام اللہ ہے اور کلام کو متکلم[3] سے بلاواسطہ تعلق ہوتا ہے گو الفاظ قرآنیہ کلام لفظی کی قسم سے ہیں مگر کلام نفسی کے ساتھ اس کو بہت قرب اور تعلق ہے اور ایسا تعلق ہے کہ اس کی تفصیل اس وقت نہیں ہوسکتی۔ اور اس تعلق کی وجہ سے اس کلام لفظی کا بھی قریب وہی حکم ہے ادب اور تعظیم میں جو کلام نفسی کا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کلام لفظی کا اتنا ادب کرتے تھے کہ کسی چیز کا اتنا ادب نہ کرتے تھے۔ بیت اللہ کو بلا طہارت کے ہاتھ لگانا جائز ہے گو ادب کے خلاف ہو مگر قرآن کی یہ شان ہے لَا یَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ کہ اس کو بدون[4] وضو کے چھونا جائز نہیں۔ اس فرق ہی سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ بیت اللہ کا درجہ کلام اللہ کے بعد ہے اور عقل کا بھی یہی مقتضا ہے کیونکہ خدا تعالےٰ مکان سے منزہ[5] ہیں پس بیت اللہ کو خدا کا گھر محض تشریفاً[6] کہدیا جاتا ہے جیسا کہ جس چیز کا مالک کوئی آدمی نہ ہو اور وہ خدا کے نام پر وقف ہو اس کو بھی خدا تعالےٰ کی طرف تشریفاً منسوب کر دیتے ہیں چنانچہ وقف کی زمین کو بھی خدا کی زمین اسی بنا پر کہدیتے ہیں۔ پس بیت اللہ کی نسبت خدا کی طرف محض تشریفی ہے۔ اور کلام اللہ

---

[1] ویرانہ وہی ہے جو دیوانہ نہیں ہوا — نقش و نگار کر دیکھو کہ بھی گھر میں نہیں گیا

[2] ان گدڑی پوش فقیروں کو حقیر نہ جانو — یہ بے تخت و تاج کے بادشاہ ہیں

[3] کلام کرنے والے۔ [4] بغیر۔ [5] پاک۔ [6] بطور تعظیم۔

کی نسبت محض تشریفی نہیں ہے بلکہ تعلق خاص کی بنا پر ہے کہ اس کلام کو کلام نفسی سے تعلق ہے۔ اور کلام نفسی خدا تعالیٰ کی صفت ہے اور صفت کو موصوف سے جو کچھ علاقہ ہوتا ہے ظاہر ہے۔ مگر اس پر بھی ہماری حالت یہ ہے کہ اگر کوئی شخص حج کرکے آوے اُس کی تو تعظیم و تکریم کرتے ہیں اور حاجی بننے کو بڑی بات سمجھتے ہیں اور جو لوگ قرآن کی تلاوت اور اُس کی تعلیم وغیرہ میں مشغول ہیں اُن کی عظمت حاجی کی برابر بھی نہیں کرتے زیادہ تو کیا کرتے اسی طرح جو لڑکا حفظِ قرآن سے فارغ ہو اس کو حج کرنے والے کی برابر نہیں سمجھتے حالانکہ قرآن کا درجہ بیت اللہ سے یقیناً بڑھا ہوا ہے۔

تلاوتِ قرآن کی اہمیت و عظمت

حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تلاوتِ قرآن سے بجز جنابت کے کوئی امر مانع نہ ہوتا تھا اس سے معلوم ہوا کہ حضور کو تلاوتِ قرآن کا بہت اہتمام تھا حالانکہ آپ اشرف المخلوقات ہیں پس جس چیز کا آپ کو اتنا اہتمام ہو اس کی عظمت کا کیا ٹھکانا ہے۔ گو یہ مسئلہ مختلف[1] فیہ ہے کہ افضل حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں یا قرآن (یعنی کلام لفظی) اس وقت میں اس مسئلہ کی تفصیل نہیں کرنا چاہتا مگر احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کلام لفظی کا بھی وہی ادب کرتے تھے جو کلام نفسی کا ادب ہے یعنی اس کے ساتھ بھی آپ کا وہی برتاؤ تھا جو کلام نفسی کے ساتھ ہوتا۔ خیر قرآن مجید و حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے تفاضل میں خواہ کچھ کلام ہو مگر اس میں شک نہیں کہ بیت اللہ سے ضرور افضل ہے۔ اور اس سے خدا کی رحمت کا اندازہ ہوتا ہے کہ خدا تعالےٰ نے قرآن عطا فرما کر ہم پر کتنا بڑا احسان و فضل فرمایا ہے کہ بیت اللہ جس کے اشتیاق میں ہم ہمیشہ رہتے ہیں، اس سے بھی افضل چیز ہمارے گھر میں ہر وقت رہتی ہے مگر افسوس ہے کہ ہم کو اس نعمت کی قدر نہیں لوگوں کے ذہن میں قرآن کی عظمت کا درجہ ابھی تک نہیں آیا ورنہ وہ قرآن کو گھر میں دیکھ کر ایسے خوش ہوا کرتے جیسے کعبہ کسی کے گھر میں آگیا (بلکہ اس سے بھی زیادہ) اب ہماری یہ حالت ہے کہ گھر میں قرآن رکھا ہوا ہے کسی کے دل پر جوں بھی نہیں رینگتی کہ یہاں

---

[1] :- اختلاف ہے

کیا چیز رکھی ہوئی ہے کبھی اس کی طرف پیر کر دیتے ہیں کبھی اُس کے اُوپر کوئی چیز رکھ دیتے ہیں۔ صاحبو! خدا سے ڈرو، بتلاؤ اگر تم بیت اللہ کو دیکھ لو تو کیا اُس کی طرف پیر کر سکتے ہو؟ ہرگز ایسی ہمت نہ ہوگی پھر کیا قرآن کو کعبہ سے بھی کم سمجھ لیا ہے۔ بعضے لوگوں کو مہینے گذر جاتے ہیں کہ قرآن کھول کر ایک دن بھی نہیں پڑھتے (یہ شخص ایسا ہی محرُوم القسمت ہے جیسے کوئی مکہ میں جا کر نہ بیت اللہ کو دیکھے، نہ اس کا طواف کرے) میں کہتا ہوں کہ اگر بالفرض تلاوت قرآن کی بھی کسی کو فرصت نہ ہو تو وہ روزانہ قرآن کو کھول کر عظمت و محبت کے ساتھ ایک نظر ہی اسکو دیکھ لیا کرے اور پھر عظمت و محبت سے بند کر کے رکھ دیا کرے تو اُمید ہے کہ انشاء اللہ یہ شخص بھی برکات قرآن سے محرُوم نہ رہے گا۔ لانّ[1] النظر الی القرآن ایضاً عبادۃ ۱۲ جامع عجب قرآن ہی کے ساتھ ہمارا یہ برتاؤ ہے اور اُسی کی عظمت ہمارے دلوں میں ویسی نہیں جیسی ہونی چاہیئے تو پھر اہلِ قرآن کی عظمت کہاں سے ہو۔ ان کو ہم اپنے سے افضل تو کیا سمجھتے بلکہ حقیر سمجھتے ہیں۔ بھلا اگر کوئی درویش بزرگ تمہارے پلنگ پر پائنتی کی طرف آکر بیٹھ جائے تو کیا تم سے یہ ہو سکتا ہے کہ تم سرہانے چڑھے بیٹھے رہو ہرگز نہیں اوّل تو تم انکو دور سے ہی دیکھ کر کھڑے ہو جاؤ گے اور ان کے سرہانے تو ہرگز نہ بیٹھو گے کیونکہ تم ان کو اپنے سے افضل سمجھتے ہو پس اگر اس حدیث کے مطابق تمہارا یہ اعتقاد ہے کہ حافظِ قرآن بھی ہم سے افضل ہے تو اس کی کیا وجہ ہے کہ ان کا ادب ایسا نہیں کیا جاتا اور اگر ادب نہ کیا تھا تو ان کو حقیر بھی نہ سمجھا ہوتا اب تو غضب یہ ہے کہ جو شخص قرآن کے حفظ میں دو تین سال صرف کرے لوگ اس کو وقت کا ضائع کرنا اور بیکار رہنا سمجھتے ہیں۔ افسوس ہماری عقلوں پر کیسا پردہ پڑ گیا ہے مگر الحمد للہ خُدا کا شکر ہے کہ اس شہر میں تو ایسا نہیں ہے کہ حفظ قرآن کو فضول سمجھتے ہوں یہاں بہ نسبت اور شہروں کے پھر قرآن کا بہت چرچا ہے اور حفاظ کی قدر بھی ہے گو جیسی قدر ہونی چاہیئے ویسی یہاں بھی نہیں مگر پھر بھی بسا[2] غنیمت ہے۔

---

[1]:۔ اس لیے کہ قرآن پاک کو دیکھنا بھی عبادت ہے۔

[2]:۔ بہت۔

صاحبو! اس حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں مشغول رہنے والے سب سے افضل ہیں اور ظاہر ہے کہ عامل کی فضیلت فرع ہے فضیلت عمل کی اس سے معلوم ہوا کہ تلاوت قرآن سے زیادہ کوئی عمل افضل نہیں پس قرآن کی تعظیم ضروری ہے. جس کے مختلف شعبے ہیں.

تعظیم قرآن کے شعبے

منجملہ تعظیم قرآن کے شعبوں کے ایک شعبہ یہ ہے کہ اس کی اشاعت کا اہتمام کیا جائے یہ اصل تعظیم ہے صرف یہی کافی نہیں کہ اس کی عمدہ جلد بنوا کر الماری میں رکھ دیا جائے بلکہ اُس کی اصل تعظیم یہ ہے کہ اس کی تعلیم و قرأت کا اہتمام کیا جائے جس کتاب کا جتنا چرچا ہوگا اُتنی ہی اس کی عظمت ظاہر ہوگی. اور اہتمام[1] اشاعت کی صورت یہ ہے کہ اپنے اپنے بچوں کو قرآن حفظ کراؤ یا کم از کم ناظرہ ہی پڑھاؤ اور جو مدارس اس کی اشاعت کے لیے قائم ہیں اُن کی امداد کرو. لوگوں کو ایسے مدارس[2] کے مہتمین کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے کہ انہوں نے اس فرض کفایہ سے سب کو سبکدوش کر رکھا ہے. نیز اشاعت قرآن کا ایک جزو یہ بھی ہے کہ جو طلبہ پردیسی تعلیم و تعلم قرآن میں مشغول ہیں. اُن کے کھانے کپڑے کا اپنی اولاد کی برابر فکر کرو. جو لوگ صاحبِ وسعت[3] ہیں وہ ایک طالب علم کا کھانا بھیجا کریں طلبہ سے یہ مت کہو کہ وہ تمہارے گھر پر آ کر کھانا لیا کریں اس میں اُن کی تحقیر ہے بلکہ تم خود اپنے ملازم یا اپنے لڑکے کے ہاتھ ان کے لیے کھانا بھجواؤ. جب گرمی جاڑے[5] میں اولاد کے واسطے کپڑے بناؤ ایک دو جوڑا طلبہ کے واسطے بھی بنا دو پہلے زمانہ میں اشاعت قرآن کی زیادہ وجہ یہ تھی کہ سلاطین[4] اور عامۂ مسلمین اُن کی خدمتیں کافی کرتے تھے جس سے اُن میں حرص و طمع[6] کا مادہ پیدا نہ ہوتا تھا کیونکہ بیٹھے بٹھلائے بلے مانگے اُن کو سب کچھ مل جاتا تھا اور عزت کے ساتھ ملتا تھا حقیر کر کے کوئی نہ دیتا تھا اسی لیے پہلے لوگ بلا اُجرت پڑھتے پڑھاتے اور تراویح میں مفت سناتے تھے.

١: اشاعت کی کوشش۔
٢: نگرانِ مدارس۔
٣: اچھی حیثیت کے مالک
٤: بادشاہ۔
٥: سردی۔
٦: لالچ۔

حفاظ کی تنظیم اورنگ زیب عالمگیر کی نظر میں

ایک مرتبہ عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ نے دیکھا کہ طالب علموں کی حالت زیادہ خستہ ہے۔ ان کو کوئی نہیں پوچھتا تو اُن کو اس سے صدمہ ہوا۔ اب دیکھئے انہوں نے اس کا کیا اچھا علاج کیا کہ دربار میں وزیرِ اعظم جس وقت آیا تو آپ نے اُس سے سوال کیا کہ تم نماز پڑھتے ہو۔ عرض کیا جی ہاں پڑھتا ہوں۔ پوچھا بتلاؤ نماز میں کتنے واجبات اور کتنی سُنتیں اور کتنے مستحب ہیں۔ وزیر سوچنے لگا کیونکہ مسائل کس کو یاد تھے۔ عالمگیر بہت خفا ہوئے کہ تم خاک نماز پڑھتے ہوگے جب تم کو مسائل بھی یاد نہیں۔ تم لوگوں سے اتنا نہیں ہوتا کہ ایک طالب علم سے نماز روزہ کے مسائل بھی پڑھ لیا کرو۔ رات دن دنیا کمانے ہی کی فکر رہتی ہے۔ دین کا کچھ بھی خیال نہیں۔ تم کیسے مسلمان ہو، تم کو شرم نہیں آتی۔ بس بادشاہ کی تو ایک بات ہوئی اور سارے دربار کے کان ہو گئے۔ وہاں سے اُٹھ کر جو یہ لوگ اپنے گھر پر پہنچے تو سب سے پہلے مدرسہ میں آدمی بھیجا کہ فلاں نواب صاحب کو ایک طالب علم کی ضرورت ہے۔ جو اُن کو دو گھنٹہ دینیات کی تعلیم دیدیا کرے۔ وزیر سے لیکر ادنیٰ درباری تک سب کو مسائل کی فکر ہو گئی اور معقول تنخواہوں پر ایک ایک طالب علم ہر شخص کے یہاں مقرر ہو گیا۔ اب کیا تھا جدھر دیکھو طلبہ کی پوچھ ہو رہی ہے۔ تو اس زمانہ میں اہل علم کو سوال کی نوبت نہ آتی تھی۔ لوگ خود ہی ان کی خدمت کرتے تھے جس سے اُن میں حرص کا مادہ پیدا نہ ہوتا تھا اور آج کل ان لوگوں کی خدمت خود کوئی نہیں کرتا اور ضرورت و احتیاج بُری بلا ہے۔ کم و بیش ضرورتیں سب کی ساتھ لگی ہوئی ہیں۔ طلبہ کو بھی ضرورتیں پیش آتی ہیں اور علم کے ساتھ وہ دنیا کمانے میں مشغول ہو نہیں سکتے۔ اس لیے خواہ مخواہ اُن کی نظر مخلوق کے اموال پر جاتی ہے اور اُن میں سوال کا مادہ ہوتا ہے اور یہی راز ہے اہل علم کی تحقیر کا۔

علماء اور مشائخ میں ایک فرق

صاحبو! درویشوں کی جو زیادہ وقعت ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ دنیا کو نظر اٹھا کر نہیں دیکھتے نہ کسی سے سوال کرتے ہیں۔ اگر اہل علم بھی ایسے ہی مستغنی ہو جائیں تو پھر قوم میں ان کی یہ تحقیر نہ ہو۔ اس میں تھوڑا سا قصور ہمارا بھی ہے کہ اہل اللہ کی طرح ہم بھی دُنیا سے کیوں نہ مستغنی ہو گئے۔ صاحبو قرآن

سے بڑھکر اور کیا دولت ہوگی پھر حیرت ہے کہ جس کے پاس قرآن ہو وہ بھی مخلوق سے مستغنی[1] نہ ہو۔ میں تو اہل علم کو ہمیشہ یہی وصیت کرتا ہوں کہ تم ہرگز لوگوں سے روپیہ کا سوال نہ کرو خدا پر توکل کرو۔ انشاءاللہ یہ سب جھک مار کر تم کو خود لاکر دیں گے۔ مگر جہاں اس میں اہل علم کا قصور ہے قوم کا بھی قصور ہے مسلمانوں کو چاہیئے تھا کہ ان لوگوں کی خدمت از خود کرتے اور اس مادہ کو ان کے اندر پیدا ہونے ہی نہ دیتے اس کی نوبت ہی کیوں آنے دیتے ہیں کہ ان کو سوال کا موقع ہو۔

رُوحانی تربیت کا اہتمام پہلے زمانہ میں لوگوں کو اسکا بہت خیال تھا کہ تربیت جسمانی کے ساتھ وہ اپنی اولاد کی روحانی تربیت بھی کرتے تھے ایک بزرگ نے اپنے بچہ کو شروع ہی سے توکل کی عملی تعلیم اس طرح دی تھی کہ اس کی ماں سے کہدیا کہ اس کو روٹی کپڑا تم خود مت دیا کرو جب یہ کھانا مانگے اس سے کہدو کہ جاؤ خدا سے مانگو۔ ہم بھی اُسی سے مانگتے ہیں اور ایک الماری مقرر کر دی تھی جس میں کھانا پہلے سے رکھدیا جاتا تھا اور لڑکے سے کہدیا کہ وہاں جاکر خدا سے دُعا کرو پھر الماری کھولو جو کچھ تیری قسمت میں ہوگا اس میں سے ملجائیگا بچہ وہاں جاتا اور دُعا کرتا اور روزانہ وہاں سے کھانا لے لیتا ایک دن اُس کی ماں کھانا رکھنا بھُول گئی بچہ اپنے معمول کے موافق الماری پر گیا اور خدا سے دُعا کی کہ اے اللہ مجھے کھانا دیدے پھر الماری کو کھولا تو وہاں کھانا موجود تھا اس کی ماں نے یہ واقعہ اُن بزرگ سے بیان کیا اُنھوں نے سجدۂ شکر کیا اور بیوی سے کہا کہ بس اب تم وہاں کھانا مت رکھا کرو اب غیب سے امداد شروع ہوگئی اور یہ بچہ کھانے پینے کی فکر سے چھوٹ گیا دُنیا میں بڑی فکر اسی کی ہوتی ہے اگر اسی طرح ہم بھی طلبہ کی روحانی تربیت کریں اور از خود ان کی خدمت کرتے رہا کریں تو ان میں استغنا[2] کی شان پیدا ہو جائے گی پھر ان کا وہ مذاق ہو جائے گا جو ایک شاہزادے کا مذاق تھا

استغناء کی عجیب حکایت جس کا قصہ میرے ایک ماموں صاحب بیان کرتے تھے کہ ایک فارس کا شہزادہ زمانہ کی گردش سے غربت میں گرفتار ہو کر

---

[1] : بے پرواہ۔ [2] : بے پروائی۔

ہندوستان آگیا تھا ایک ہندوستانی رئیس سے اتفاقاً لکھنؤ کی سرائے میں ملاقات ہو گئی شہزادہ نے اس رئیس کی دعوت کی اُس نے شہزادہ سے درخواست کی کہ اگر آپ میری ریاست میں آدیں تو میں آپ کی کچھ خدمت کروں کسی موقع پر پھرتے پھراتے اُس درخواست کو یاد کرکے نہایت خستہ حالت میں اس کے پاس جا پہنچا اس رئیس نے شاہزادہ کو اس خستہ حالت میں دیکھ کر تاسفاً یہ شعر پڑھا ؎

آنکہ شیراں راکند روبہ مزاج ‏ ‏ ‏ ‏ احتیاج است احتیاج است احتیاج

شہزادے کو سخت ناگوار ہوا اور فوراً ہی برجستہ جواب دیا ؎

شیر نرکے می شود روبہ مزاج ‏ ‏ ‏ ‏ می زند برکفش خود صد احتیاج

یہ کہہ کر اسی وقت واپس ہو گیا ایک منٹ بھی نہ ٹھہرا رئیس نے بڑی ہی خوشامد کی کہ میں نے تو تاسفاً کہا تھا تحقیراً نہ کہا تھا اُس نے ایک نہیں سُنی اور کہا کہ تم ہرگز اس قابل نہیں ہو کہ کوئی شریف آدمی تمہارے پاس ٹھہرے۔ میں ہرگز نہ ٹھہروں گا۔ یہ کہہ کر چلتا ہوا۔ جب آدمی میں استغناء کی شان پیدا ہو جاتی ہے تو پھر وہ کسی بڑی سے بڑی مصیبت میں بھی سوال کرنا گوارا نہیں کرتا۔

دینی غیرت کی عجیب حکایت

عبدالرحمٰن خانصاحب مرحوم مالک مطبع نظامی حکایت کرتے تھے کہ ایک حافظ صاحب لکھنؤ کے جو کہ قاری بھی تھے حج کرنے گئے تھے واپسی میں جب وہ جہاز سے اُتر کر وطن کو چلے تو راستہ میں لُٹ گئے۔ ایک پیسہ بھی پاس نہ رہا مگر اللہ کے بندے نے کسی سے بھی سوال نہ کیا پیدل ہی چل پڑے راستہ میں کسی بستی میں راحت لینے کے خیال سے ٹھہرے اُس وقت اُن پر کئی وقت کا فاقہ تھا ایک مسجد میں ٹھہر گئے اور کسی سے اپنی حاجت کا ذکر نہیں کیا قرآن بہت عمدہ پڑھتے تھے لوگوں نے قرآن سُنا معتقد ہو گئے اُس بستی میں کوئی رئیس تھے لوگوں نے

؎ جو چیز شیروں کے مزاج کو لومڑی کا مزاج بنائے وہ صرف احتیاج ہے احتیاج۔
شیر نر کب لومڑی مزاج ہوتا ہے وہ تو سو احتیاجیں اپنی جوتی پر دے مارتا ہے۔

ان تک بھی خبر پہنچائی کہ ایک قاری صاحب یہاں آئے ہوئے ہیں بہت عمدہ قرآن پڑھتے ہیں مگر بیچارے خستہ حال ہیں راستہ میں کہیں لٹ گئے ہیں۔ پہلے زمانہ میں رؤسا کو علم کی قدر تھی اور اہل علم کی خدمت بھی بہت کیا کرتے تھے۔ وہ رئیس قاری صاحب کے پاس مسجد میں مع سامان خدمت نقد پارچہ وغیرہ حاضر ہوئے اور قرآن سننے کی درخواست کی۔ اوّلاً انہوں نے عذر فرمایا کہ میں جب نماز میں پڑھوں گا سن لیجئے گا انہوں نے زیادہ اصرار کیا تو انہوں نے کچھ پڑھ دیا۔ قرآن سن کر عجیب حالت ہو گئی اور اسوقت ایک خوان میں روپے اور اشرفیاں جو کر لائے تھے رکھکر پیش کیں قاری صاحب نے فرمایا کہ اس وقت جتنی چیزیں آپ نے پیش کی ہیں مجھے ان سب کی ضرورت ہے مگر چونکہ آپ نے قرآن سن کر یہ ہدیہ پیش کیا ہے اس لیے میں اس کو قبول نہیں کر سکتا یہ تو قرآن کا بیچنا ہوا اور حق تعالےٰ فرماتے ہیں۔ لَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا[1] اب تو اگر سلطنت بھی دو گے تو نہ لوں گا اگر تم قرآن سننے سے پہلے دیتے تو میں قبول کر لیتا باقی اسوقت لینا تو سراسر قرآن کو بیچنا ہے بعض رئیسوں کو خدمت کرنے کا شوق تو ہوتا ہے مگر خدمت کا طریقہ نہیں آتا پس اہل اللہ کو دین کی غیرت ایسی ہی ہونی چاہیئے جیسی ان قاری صاحب کو غیرت تھی۔ اور دین کی عزت کا پورا خیال رکھنا چاہیئے مگر یہ کب ہو گا یہ جبھی ہو سکتا ہے جبکہ دونوں طرف سے خیال ہو علماء استغنا سے رہیں اور عام لوگ اُن کی خدمت خود کرتے رہیں ورنہ یہ حاجت ایسی چیز ہے کہ کبھی نہ کبھی اُبل کر رہتی ہے جس میں آدمی بعض اوقات بے اختیار ہو جاتا ہے۔ اس پر ایک حکایت یاد آئی۔ ایک رئیس نے ایک باورچی ملازم رکھا تھا جس کی خشک تنخواہ مقرر کی۔ باورچی خشک تنخواہ پر بہت کم رہتے ہیں مگر اس نے یہ خیال کر کے منظور کر لی کہ آخر تھوڑا بہت کھانا تو بچے ہی گا میں اس میں گزر کر لوں گا۔ اب اس نے کھانا پکایا۔ اوّل تو اُس کو سامان ہی اتنا ملا جو بالکل نپا تُلا تھا۔ پھر وہ کھانا سامنے لایا تو یہ خیال کیا کہ ایک دو روٹی تو بچے ہی گی ایسا بھی کیا ہے کہ سارے کا صفایا کر دیں گے۔ رئیس نے کھانا شروع کیا اور باورچی نے روٹیاں گننی شروع کیں اُس اللہ کے بندے نے سب

---

[1] میری آیات کے بدلے ثمن قلیل نہ لو۔

ہی ختم کر دیں اس نے سوچا سالن بچ گیا ہے میں اسی کو پی کر سہارا کر لوں گا رئیس نے سالن کا برتن بھی صاف کرنا شروع کر دیا اس میں کچھ بوٹیاں اور ایک ہڈی تھی باورچی نے خیال کیا کہ ایک آدھ بوٹی تو بچے گی وہ بھی ختم ہوئی تو سوچا کہ خیر ہڈی ہی چوس لوں گا مگر رئیس نے ہڈی بھی چوسنے کو اٹھائی۔

اب تو باورچی سے نہ رہا گیا بیساختہ بڑی زور سے منہ سے نکلا کہ ہائے ہڈی بھی چوس لی۔ رئیس چونک اٹھا کہ کیا بات ہوئی معلوم ہوا کہ یہ حضرت بڑی دیر سے ایک مراقبہ میں ہیں۔ تو دیکھئے اُس باورچی سے صبر کرتے کرتے آخر نہ رہا گیا۔ احتیاج اُبل ہی پڑی۔

یہی حال ہر ضرورت مند کا ہے جب آدمی صبر کرتے کرتے تھک جاتا ہے تو احتیاج زبان پر آ ہی جاتی ہے۔ البتہ کوئی بڑا ولی کامل ہو جس کو توکل کی پُوری قوت نصیب ہو وہ ہرگز اپنی احتیاج کسی پر ظاہر نہیں کر سکتا۔ مگر سب کا فرشتہ ہونا بھی تو مشکل ہے جب سارے طلبہ و علماء فرشتے نہیں بن سکتے تو علماء کی شان استغنا جبھی باقی رہ سکتی ہے جبکہ آپ بھی تو ان کا خیال رکھیں۔

عُلماء کی خدمت مُسلمانوں کے ذمہ فرض ہے

اور آپ کے ذمہ اُن کی خدمت ضروری بھی ہے کیونکہ وہ آپ ہی کے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ دین کی حفاظت سب مُسلمانوں کے ذمہ فرض ہے تو یہ سب مُسلمانوں کا کام ہے جو لوگ علم دین کی تعلیم و تعلم میں لگے ہوئے ہیں وہ سب مُسلمانوں کی طرف سے فرض کفایہ کو ادا کر رہے ہیں اگر یہ لوگ پڑھنا پڑھانا چھوڑ دیں تو پھر یہ کام ہر شخص پر فرض ہو جائے اور اگر کسی نے بھی اس کو انجام نہ دیا تو سب گنہگار ہوں گے پس یہ تو ثابت ہو گیا کہ جو لوگ علم دین میں مشغول ہیں وہ آپ ہی کے کام میں لگے ہوئے ہیں اور تجربہ و مشاہدہ سے یہ بات ثابت ہے کہ علم دین کے ساتھ کسب معاش کا کام نہیں ہو سکتا اور اگر کوئی ایسا کرنا بھی چاہے تو اس کو علم دین کامل طور پر نہ حاصل ہو گا۔ ایک آدمی ایک زمانہ میں دو ایسے کام نہیں کر سکتا جن کے لیے پورے انہماک کی ضرورت ہے۔ اس مقدمہ کے ساتھ اب دوسرا مقدمہ یہ ملایئے کہ شریعت کا قانون ہے کہ جو شخص کسی کے کام میں محبوس[1] ہو اُس کا نفقہ اُسی کے ذمہ ہے جس

[1] روکنا، قید، پابند۔

کے کام میں وہ محبوس ہے چنانچہ بیوی کا نفقہ شوہر کے ذمہ اسی وجہ سے ہی کے ہے قاضی کی تنخواہ سب مسلمانوں کے ذمہ اسی لیے ہے کہ وہ ان کے کام میں محبوس ہے بیت المال سے ملنا گویا سب مسلمانوں کے پاس سے ملنا ہے اسی قاعدہ سے اہل علم کا نفقہ تمام مسلمانوں کے ذمہ ہے اُن کو خود ان کی خدمت کرنا چاہیئے اگر ہم اہل قرآن کی خدمت نہ کریں گے تو اس سے یہ سمجھا جائے گا کہ ہمارے نزدیک تعلیم و تعلم قرآن کی کچھ وقعت بھی نہیں حالانکہ اس حدیث میں اس کی فضیلت صاف موجود ہے کہ قرآن کی تعلیم و تعلم میں جو لوگ مشغول ہیں وہ سب سے افضل ہیں۔

اعتقاد سے اصل مقصود عمل ہے اگر کوئی کہے کہ حدیث پر ہمارا تو اعتقاد ہے۔ تو خوب سمجھ لو کہ جب اس پر عمل نہیں اور جس اعتقاد کے موافق عمل نہ ہو وہ اعتقاد ناتمام ہے تو وہ اعتقاد بھی ناتمام ہوگا۔ اور یہ جو بہت لوگ سمجھے ہوئے ہیں کہ علوم اعتقادیہ سے صرف علم مقصود ہے کہ بس اس بات کا عقیدہ دل میں رکھو عمل چاہے کیسا ہی ہو یہ بالکل غلط ہے عقائد سے مقصود تو علم تو ہے ہی مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی مقصود ہے کہ عقیدہ کے ذریعہ سے عمل میں خلوص و کمال پیدا ہو اور یہ بہت موٹی بات ہے غور کیجئے اگر کوئی شخص آپ سے یہ کہے کہ یہ آدمی جو سامنے آرہا ہے۔ بادشاہ وقت ہے تو اس کا مطلب کیا ہوتا ہے کیا اس کا صرف یہی مطلب ہوتا ہے کہ بس اس کو دل میں بادشاہ سمجھ لو یا یہ مطلب ہوتا ہے کہ عملاً اس کی تعظیم و تکریم بھی بجالانا چاہیئے۔ چنانچہ اگر وہ شخص بادشاہ کے قریب پہنچ کر اُسے سلام بھی نہ کرے نہ ادب و تعظیم ظاہر کرے تو دوسرا شخص جھلا کر کہتا ہے کہ تو بڑا احمق ہے۔ تجھ کو معلوم ہو گیا تھا کہ یہ بادشاہ ہے اور پھر تو نے اس کی تعظیم نہ کی معلوم ہوا کہ علوم اعتقادیہ سے عمل بھی مقصود ہوتا ہے اگر عمل اعتقاد کے موافق نہ ہو تو عرفاً یہی سمجھا جاتا ہے کہ اس شخص کو یہ بات معلوم ہی نہیں اسی طرح شریعت میں بھی عقائد کا صرف جان لینا مقصود نہیں بلکہ اُن کے ذریعہ سے عمل کی تکمیل بھی مقصود ہے کیونکہ اعتقاد کو تکمیل عمل میں بہت دخل ہے پس اگر کسی بات کا اعتقاد ہو اور عمل اس کے موافق نہ ہو تو یقیناً اعتقاد ہی ناتمام ہے اور حکم ہے تکمیل دین کا اس لیے یہ ضرور ہے کہ اعتقاد کی موافقت عمل سے بھی ہو۔ اور اس مسئلہ

کی دلیل میرے پاس قرآن سے ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں، مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَةٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ یَسِیْرٌ ۝ لِّكَیْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ۝ **ترجمہ**:۔ یہ ہے کہ کوئی مصیبت نہ دنیا میں آتی ہے اور نہ خاص تمہاری جانوں میں مگر وہ (سب) ایک کتاب (یعنی لوح محفوظ) میں لکھی ہوئی ہیں اُن جانوں کے پیدا کرنے سے پہلے ہی اس میں مسئلہ تقدیر کی تعلیم دی گئی ہے کہ جو کچھ مصائب داخلی و خارجی آتی ہیں وہ سب پہلے سے مقدر ہیں اور لوح محفوظ میں تمہارے پیدا ہونے سے پہلے ہی لکھدی گئی ہیں آگے فرماتے ہیں اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ یَسِیْرٌ ا۔ اور یہ اللہ کے نزدیک آسان کام ہے اس میں اپنے علم محیط کی طرف اشارہ فرمادیا کہ یہ کام اس لیے دشوار نہیں کہ ہمارا علم محیط ہے ہم کو پہلے ہی سے سب کچھ معلوم تھا آگے فرماتے ہیں لِكَیْلَا تَاْسَوْا اس میں لام کے ہے جو علت پر داخل ہوتا ہے تو یہ علت کس چیز کی ہے اور لام کا متعلق یہاں کیا ہے سو بات یہ ہے کہ اس کا متعلق محذوف ہے تقدیر یہ ہے كَتَبْنَا ذٰلِكَ وَاَخْبَرْنَاكُمْ بِهٖ لِكَیْلَا تَاْسَوْا الخ کہ ہم نے تم کو اس کی خبر اس لیے کر دی ہے تاکہ اگر کوئی چیز تم سے جاتی رہی تو تم اس پر رنج نہ کرو (یعنی اتنا رنج نہ کرو جو آخرت کے کاموں سے تم کو روک دے طبعی رنج کا مضائقہ نہیں) اور جو چیز تم کو عطا ہوئی ہے اس پر اتراؤ نہیں کیونکہ جب یہ معلوم ہو گیا کہ جو کچھ راحت و رنج پہنچتا ہے پہلے سے سب مقدر ہے تو اب نہ زیادہ رنج ہوگا۔ اور نہ تکبر و ناز کی صفت پیدا ہوگی قاعدہ ہے کہ مصیبت کا علم جب پہلے سے ہو جاتا ہے تو وہ ہلکی ہو جاتی ہے پس اجمالاً ہر مصیبت کے متعلق ہمکو یہ معلوم ہو گیا ہے کہ جو کچھ ہوگا۔ تقدیر سے ہوگا اس سے بہت تسلی ہو جاتی ہے اگر تقدیر کا اعتقاد نہ ہو تو بڑی پریشانی ہوتی ہے کہ ہائے ہمنے یہ تدبیر کیوں کی وہ تدبیر کیوں کی اور جب تقدیر کا اعتقاد ہوتا ہے تو دل میں یہ مضمون پیدا ہو جاتا ہے کہ چاہے کچھ ہی تدبیر کرتے یہ واقعہ تو ہونا ہی تھا۔ مقدر یوں ہی تھا اسی طرح اترانا وہ ہے جس نے راحت و خوشی کا سامان اپنے آپ پیدا کیا ہو اور جب یہ عقیدہ ہوگا کہ جو کچھ ملتا ہے مقدر سے ملتا ہے تو نہ تو خود اترا وے گا اور نہ دوسروں کو حقیر

سمجھے گا جاننے گا کہ میرے پاس جتنی نعمتیں ہیں ان میں کچھ میرا کمال نہیں تقدیر ہی سے ملا ہے جو کچھ ملا اور جس کے پاس نہیں ہے، اس کی تقدیر میں یہی لکھا تھا پس نہ میں صاحب کمال ہوں نہ وہ ناقص ہے پھر ناز و تکبر کاہے کا یہ تو آیت کا مطلب ہوا مجھ کو تبلانا یہ ہے کہ اس آیت میں حق تعالے نے مسئلہ تقدیر بیان فرما کر اس کے ذکر کی علت یہ تبلائی ہے لکیلا تاسوا ولا تفرحوا[۱] اس سے صاف معلوم ہوا کہ عقائد سے مقصود صرف اعتقاد ہی نہیں بلکہ ان کے ذریعہ سے عمل کی تکمیل بھی مقصود ہے۔ اسمیں لوگ بہت دھوکہ کھائے ہوئے ہیں اکثر لوگ عقائد کو عمل کے لیے مقصود نہیں سمجھتے بلکہ یہ سمجھتے ہیں کہ عقائد صرف جاننے ہی کے لیے ہیں۔ اس آیت سے ان کی غلطی معلوم ہو گئی پس اگر ہم اہل قرآن کی خدمت نہ کریں گے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ہم کو اس حدیث پر ناتمام اعتقاد ہے اور اب تک ہمارے عقیدے بھی درست نہیں ورنہ اس کی کیا وجہ کہ عقیدہ کے موافق ہمارے اعمال نہیں ہیں۔

قرآن پڑھنا اور پڑھانا تمام اعمال سے افضل ہے

اس حدیث سے ایک تو یہ مسئلہ مستنبط[۱] ہوا تھا کہ اہل قرآن کو سب سے افضل سمجھنا چاہیئے ایک دوسرا جزیہ بھی مستنبط ہوا کہ تعلیم و تعلم قرآن تمام اعمال سے افضل ہے کیونکہ عامل کا افضل ہونا بوجہ عمل کی فضیلت کے ہے چنانچہ ایک جگہ حق تعالے کا ارشاد ہے كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ۔ تم بہترین امت ہو جو لوگوں (کی ہدایت) کے لیے ظاہر کی گئی تم نیک کاموں کا حکم کرتے بُرے کاموں سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو اس میں حق تعالے نے خیر امت ہونے کی علت تامرون بالمعروف الخ بیان فرمائی ہے جو کہ بہت سے اعمال خیر کو مشتمل ہے معلوم ہوا کہ افضلیت ذات کا مدار[۲] اعمال کی فضیلت پر ہے۔ ایک مقدمہ یہ ہوا اس کی ساتھ ایک اور مقدمہ بھی سنیئے حق تعالے فرماتے ہیں۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ

---

[۱]: ظاہر   [۲]: انحصار

عَنِ الْمُنْكَرِ ط اور (اے مسلمانو!) تمہارے اندر ایک جماعت ایسی بھی ضرور ہونی چاہیئے جو خیر کی طرف (لوگوں کو) ترغیب دے اور نیک کاموں کا حکم کرے ۱۴ اس میں اعمالِ خیر کی طرف رغبت دلانے اور دعوت دینے کا امر ہے اور امر وجوب کے لیے ہوتا ہے۔

دستار بندی ایک ترغیب ہے اور قرآن وحدیث سے ثابت ہے

پس ایسی ایک جماعت کا ہونا واجب ہے جو اعمالِ خیر کی ترغیب دے اور تعلیم و تعلم قرآن کا خیر الاعمال ہونا ثابت ہو چکا ہے تو اس کی ترغیب دینا بھی ضروری ٹھہرا اور ترغیب کی دو صورتیں ہیں ایک تو ان کی اعانت کرنا ان کی خدمت کرنا ان کی عزت و عظمت کرنا اور ایک طریقہ وہ ہے جو بزرگوں نے اختیار کیا ہے کہ جو شخص قرآن سے فارغ ہو اس کی دستار بندی کی جائے اس سے بھی فارغین کو مسرت ہونے کے سبب تعلم[1] قرآن کی طرف اور ان کے سرپرستوں کو تعلیم قرآن کی طرف بہت رغبت ہوتی ہے اور تعلم کا سبب بنجانا یہ بھی تعلیم کا ایک مصداق ہے۔ پس یہ عمل خلاف سنت نہیں ہے کیونکہ اعمال خیر کی طرف رغبت دلانے کا نص میں حکم وارد ہے اور یہ بھی اسباب رغبت میں سے ہے پس صراحۃً تو نہیں مگر دلالۃً یہ بھی نص سے ثابت ہوا غرض اس دستار بندی سے خود لڑکوں کو بھی رغبت ہوتی ہے کہ اگر اچھی طرح یاد کریں گے تو ہماری دستار بندی ہوگی نیز والدین کو بھی اس سے خوشی ہوتی ہے نیز اگر لڑکوں میں صلاحیت ہوئی تو ان کو خیال ہوگا کہ اب ہم بڑے بنا دیئے گئے اب ہم کو تقوے طہارت اختیار کرنا چاہیئے یہ تو قرآن سے دستار بندی کا ثبوت اور اس کی فضیلت معلوم ہوئی اب احادیث سے بھی اس کا ثبوت بیان کرتا ہوں ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص ظہرِ قلب سے قرآن پڑھے (اس سے حفاظ کے عمل کی تائید ہوتی ہے کیونکہ وہ اکثر تلاوت قرآن بدون[2] دیکھے ہوئے کیا کرتے ہیں معلوم ہوا کہ یہ عمل عنداللہ مقبول ہے) تو اس کے والدین کو قیامت میں ایسا تاج پہنایا جائے گا جس کی روشنی

---

[1]: قرآن سکھانے۔ [2]: بغیر دیکھے (حفظ)۔

کے سامنے چاند و سورج بھی ماند پڑ جائیں گے یہ حدیث صحاح میں موجود ہے اور گو اس میں حافظ کے لیے کسی بات کی تصریح نہیں بلکہ اس کے والدین کا اجر مذکور ہے مگر جب حافظ کی بدولت والدین کا یہ حال ہوگا۔ تو خود اُس کے لیے یہ فضیلت بدرجۂ اولےٰ ثابت ہوئی چنانچہ اسی حدیث میں یہ بھی ہے اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کے ساتھ تاج کو کچھ خصوصیت ہے اور عمامہ بھی مثل تاج ہے اس لیے اشارۃً اس عمل کا مستحسن ہونا حدیث سے بھی ثابت ہو گیا اور طبرانی کی ایک روایت تو اس مضمون میں بہت ہی صریح ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کسی کو حاکم بناتے تو اس کے سر پر اپنے ہاتھ سے عمامہ باندھ دیا کرتے تھے الخ اور ظاہر ہے کہ حافظ و عالم بھی قوم کا مقتدا[1] ہونے کی وجہ سے حاکم کے مثل ہے تو سند فراغ کے ساتھ انکی دستار بندی بھی اس حدیث کے موافق ہے مگر چونکہ مجھے اس حدیث کی سند کا حال معلوم نہیں اس لیے میں نے اُس کو سب کے بعد میں بیان کیا اگر یہ حدیث صحیح ہو تب تو دلیل اس فعل کے مقبول ہونے کی بہت صریح ہے اور اگر صحیح نہ ہو تو گذشتہ دلائل بھی مدعیٰ کے اثبات میں کافی ہیں، غرض یہ عمل خلاف سنت نہیں ہے۔ یہ مختصر بیان اسوقت کافی ہے اب لڑکوں کو بلا کر دستار بندی کر دی جائے اور اس وعظ کا نام میں التعمیم لتعلیم القرآن الکریم رکھتا ہوں اس میں لام صلہ کا بھی ہو سکتا ہے معنے یہ ہونگے کہ تعلیم قرآن کے عام کرنے کا بیان اور لام اجلیہ بھی ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں معنے یہ ہونگے کہ تعلیم قرآن کی وجہ سے دستار بندی کا بیان۔

اس کے بعد دستار بندی شروع ہوئی اور حضرت حکیم الامت نے اپنے ہاتھ سے سب طلبہ کے سروں پر عمامے[2] باندھے پھر دعا پر جلسہ ختم ہوا۔

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین وصلی اللّٰہ علےٰ سیدنا محمد وعلےٰ آلہٖ وصحبہٖ اجمعین۔

تمت بالخیر

---

[1] امام / قابلِ تقلید۔ [2] پگڑی / دستار